حافظ صفوان محمد چوہان

انچارج پی ٹی سی ایل ٹریننگ سنٹر، ملتان

اردو کے ہند فارسی رسمِ خط کا ارتقا اور ''رسم الخط'' کی تدوین

Abstract:

This article deals with the birth and evolution of Indo-Perso-Arabic script & its alphabet set and concludes with the editing of Deputy Nazeer Ahmad's reader viz *Rasm ul Khatt* whose latest edition is published recently in 2021. In the first part of this article, after quickly discussing the history of Urdu script and traversing topics like spelling-pronunciation relationship etc., the author has briefly discussed difference between writing system, script, alphabet, orthography and word, and then between word, dictionary word, dictionary entry/ headword, lexical item and lexeme, etc. While establishing his long-held take on Urdu alphabet-set to be comprising 38 letters and while emphasising the need of retaining the written shapes of Urdu words as are familiar to the Urdu world, the author suggests فلمچہ as the Urdu equivalent of Visual Gestalt; and has claimed that Deputy Nazeer Ahmad was the first scholar to advance the idea of Ghost Character Theory (GCT) in Urdu alphabet system. The author briefly discusses the role of Fort William College in his analysis of the sensitive topic of Urdu-Devanagari conflict and the language policy of EIC and British Raj.

Second part of this article deals with an in-depth critical study of the reader in question and its editing.

Keywords: Writing System, Script, Alphabet, Visual Gestalt, Lexical Item, Dictionary Word, Ghost Character Theory, IPA

بولنے کے مقابلے میں لکھنے کی حیثیت ثانوی ہے۔ دنیا کی بڑی آبادی آج بھی اَن پڑھ ہے یعنی نہ لکھ سکتی ہے نہ پڑھ سکتی ہے، لیکن اَن پڑھ کے مقابلے میں ''اَن بول'' کوئی نہیں ملے گا سوائے اِس کے کہ کوئی گونگا ہو۔ انسان کو حیوانِ ناطق اِسی لیے کہتے ہیں کہ بولنا انسان کا حیاتیاتی وظیفہ ہے جو اُسے دیگر حیوانات میں ممتاز کرتا ہے۔

دنیا میں جتنی زبانیں ہیں اُتنے رسمِ خط نہیں ہیں بلکہ پہلے سے موجود خطوں میں ضروری تبدیلیوں اور اضافوں نے اِن زبانوں کے لیے لکھت کی یہ گنجائشیں پیدا کی ہیں۔مثال لیجیے کہ سامی نظامِ تحریر جن سامی یا غیر سامی زبانوں کے لیے استعمال کیا گیا اُن میں نقاط اور اِعراب وغیرہ کے اضافوں سے ہر جگہ کی مقامی ضروریات کے مطابق وسعت پیدا کی جاتی رہی، البتہ اِس کے بنیادی نظام اور اِس میں شامل حروف اور اُن کی ترکیبی ہیئتوں میں تبدیلی نہ آسکی۔یہ ایک بہترنظامِ تحریر کی فطری خوبی ہے۔

جب بہت سی زبانیں بعض اضافوں اور ترامیم کے ساتھ ایک ہی نظامِ تحریر میں لکھی جاتی ہیں تو اِن پیدا شدہ نئی گنجائشوں کے ساتھ رفتہ رفتہ ہر زبان کے لیے ایک رسمِ خط مخصوص ہوجاتا ہے اور مختلف زبانوں کے رسمِ خط حروفِ تہجی کے فرق سے پہچانے جاتے ہیں۔نتیجے پر پہنچنے کی جلدی کی جائے تو اِس سادہ حساب کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ کوئی دو زبانیں ایک رسمِ خط نہیں رکھتیں، تاہم ذرا سا نواحی مطالعہ اِس نتیجے کا سقم ظاہر کر دیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ زبانیں ایک سے زائد رسومِ خط میں لکھی جا رہیں اور رسومِ خط ایک سے زائد زبانوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔رسمِ خط دراصل زبان کا نہیں بلکہ علاقے کا ہوتا ہے؛ ایک بڑے جغرافیے میں جتنی بھی زبانیں بولی جا رہی ہوں وہ ادبدا کر اُسی معروف رسمِ خط میں لکھی جاتی ہیں جو وہاں حاوی ہے۔اِس اصول پر جانچیں تو مثلاً یورپ کی بہت سی زبانیں آج بھی رومن حروف میں لکھی جاتی ہیں اور وہاں رہنے والے عرب، روسی اور پاکستانی وغیرہ وغیرہ اپنی زبانوں کو رومن حروف میں لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، یا مثلاً ہندوستان میں آج بیشتر زبانوں کا رسمِ خط دیوناگری ہوگیا ہے اور پاکستان کی بیشتر علاقائی زبانوں کا اردو۔کسی دور میں کسی زبان کا ایک سے زائد رسومِ خط میں باقاعدہ لکھا جانا سماجی اور معاشی طور پر اُس کی کارآمدگی نیز سیاسی و علمی ضرورت کی دلیل ہے۔

اِس نقطے پہ پہنچ کر زبان اور بولی میں فرق کا نکتہ رسمِ خط کے حوالے سے بھی واضح ہوجاتا ہے۔بولی چونکہ کسی بڑی زبان کی ذیلی شاخوں میں سے ایک ہوتی ہے جو کسی مخصوص جغرافیائی حدود میں اور کسی خاص عہد میں یا کسی مخصوص شعبے کے لوگوں میں مستعمل ہوتی ہے اِس لیے اُس کا کوئی رسمِ خط نہیں ہوتا سوائے بسا حالات بعض علامتیں مخصوص کرلینے یا گھڑ

لینے کے جیسے چور بولی (Argot)، یا جیسے ایک وقت تک ہندوستان میں بعض علاقوں میں ٹھگی بولی تھی، وغیرہ؛ اور اگر بولی کو باقاعدہ لکھنا پڑ جائے تو وہاں کی حاوی زبان ہی میں لکھا جائے گا۔شانتی رنجن بھٹّا چاریہ (۱۹۸۸ء) نے درست لکھا ہے کہ:

''بولیاں عموماً بولی ہی جاتی ہیں، اُن کا اپنا کوئی رسمِ خط نہیں ہوتا۔اور لوگ جب بولیوں میں لکھتے ہیں تو اُسی رسمِ خط کو استعمال کرتے ہیں جو اُس علاقے کی کسی بڑی زبان کا رسمِ خط ہو، یا جس زبان کی وہ ایک بولی ہو''۔[۱]

تاریخی شواہد کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اردو زبان کا رسمِ خط بھی اِسی طرح رفتہ رفتہ مخصوص ہوا اور اِس کے لیے عربی اور فارسی رسومِ خط کی توسیعی شکلیں بطور اینٹ (Building Blocks) استعمال ہوئیں۔اردو کے موجودہ رسمِ خط کو اِس لیے عربی اور فارسی خط نہیں کہا جاسکتا کہ اِس میں اردو کی مخصوص آوازوں کے لیے نقطوں اور اِعراب وغیرہ کے اضافی استعمال سے نئے حروف کی شکلیں متعین کی گئی ہیں؛ عربی فارسی حروفِ تہجی پر اِس نوعیت کے اضافے عثمانی عہد کی ترک زبان اور بھاشا انڈونیشیا وغیرہ میں بھی مستعمل رہے ہیں۔اردو جاننے والا شخص عربی اور فارسی کی تمام آوازیں حروف کی شکلوں کو دیکھ کر نکال سکتا ہے لیکن عربی فارسی لوگ اردو کے بہت سے حروف کے لیے مخصوص آوازیں نہیں نکال سکتے۔فارسیائے ہوئے اِس خط کو ہندفارِبی (Indo-Perso-Arabic) رسمِ خط کہتے ہیں۔[۲]

اردو کا ہندفارِبی رسمِ خط، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، عربی فارسی رسومِ خط کی وہ توسیع شدہ شکل ہے جو خالصۃً ہندوستان میں پیدا ہوئی۔فارسی نے جب عربی خط اپنایا تو اپنی ضرورتوں کے مطابق اُس میں کئی منقوط حروف اور ک پر ایک اور کشش کے اضافے سے گ کا اضافہ کر لیا، اور ازاں بعد برِصغیر کی بعض دیگر زبانوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اِس پر متعدد اضافے کیے۔

تاہم تبدیلیوں اور اضافوں کا یہ عمل فوراً نہیں ہوا بلکہ تاریخی شہادتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اِن حروف کی موجودہ شکلیں متعین ہونے میں خاصا وقت لگا۔البتہ فارسی کا قدیم رسمِ خط بدلتے عملی، لسانی، صوتی اور تہذیبی تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا اور ایران میں آہستہ آہستہ معدوم ہوگیا۔[۳]

برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور پے در پے حکومتیں قائم ہونے سے انتظامی اور منصفی کے اداروں میں، اور مشترک اندلمانی تہذیب ابھرنے کی وجہ سے مختلف شعبہائے زندگی میں، ہندفارسی رسمِ خط کا چلن ہوگیا۔اِس کی ایک بڑی وجہ فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا بھی تھی جو فاتحین اور قابضین کی زبان تھی۔یاد رہے کہ فارسی صرف مسلمانوں کی زبان نہ رہی بلکہ مرہٹہ سرکار اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خالصہ دربار کی زبان بھی بن گئی، اور رنجیت سنگھ جسے اصولاً فارسی خط کو دیس نکالا دینا چاہیے تھا اُس نے بھی اچھی حکمرانی کا ثبوت دیا اور آس پاس کی حکومتوں سے معاملت کے لیے فارسی خط ہی کو چلائے رکھا۔الغرض ہندوستان میں ہندفارسی رسمِ خط کے باضابطہ "نفاذ" کی کوئی تاریخ تو نہیں ملتی تاہم تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یہ خط تمام ضروری جگہوں پر عام چلن میں آکر مقامی خطوں پر حاوی ہوچکا تھا۔

برِصغیر کے مسلمان فاتحین نے عربی فارسی خط اِس لیے بھی اختیار کیا کہ وہ عرب اور ایران میں اِسی یعنی دائیں سے بائیں لکھاوٹ سے آشنا تھے جب کہ یہاں پر ویدک دور سے چلتا آتا سنسکرت خط موجود تھا جو بائیں سے دائیں لکھا جاتا ہے۔چنانچہ اصل مخاصمت رسمِ خط کی نہیں بلکہ لکھاوٹ کے رخ (سمت) کی محسوس ہوتی ہے۔مسلمانوں کے ہاں داہنی طرف اور داہنے ہاتھ سے کام کرنے کو مذہبی بنیاد بھی حاصل ہے۔

برِصغیر میں فارسی زبان و رسمِ خط لے کر آنے والے فاتحین سے لودھی اور سوری فاتحین کی جنگ رہی، اور پٹھان بھی فارسی اپنانے کے اِتنا حق میں نہ تھے، چنانچہ ظاہراً یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ترک حکمرانوں کی عملداری کا پایہ مضبوط ہونے تک کا زمانہ فارسی زبان اور رسمِ خط کے لیے سازگار نہیں تھا۔البتہ قیاس ہے کہ کشاکش کے اِس ماحول نے دیسی زبانوں کے ابھرنے کا فطری موقع پیدا کیا کیونکہ برج، اودھی اور قنوجی کے بعض شاعر اِسی دور کے ہیں۔ قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ اِس دور میں ایک طرف کھڑی بولی یا دہلوی میں بھی شاعری کی گئی ہوگی اور یہ کسی رسمِ خط میں لکھی بھی گئی ہوگی تو دوسری طرف ہمالیہ کی ترائی سے لے کر جمنا تک پھیلے پنجاب کی پنجابی اور مکران کے ساحل کی سندھی بھی کسی نہ کسی رسمِ خط میں لکھت میں آتی ہوں گی۔سماجی لسانیات سے اِس قیاس اور دعوے کی دلیل صرف یہ دی جاسکتی ہے کہ

اُس دور میں اِن علاقوں میں جو لوگ آباد تھے وہ گونگے بہرے اور اندھے نہ تھے چنانچہ بولتے سنتے اور لکھتے تھے۔ابھی تک اُن کی تحریر کا تاریخی ثبوت مہیا نہ ہونا، یا مہیا ثبوت کا ناکافی ہونا، تاریخی شہادتوں کے محفوظ نہ ہونے کی دلیل ہے۔

دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد عربی فارسی حروف کا باقاعدہ چلن میں آنا تاریخی حقائق سے ثابت ہے۔ڈاکٹر ساجد جاوید چودھری نے ''زبانِ حکمرانی'' کی اصطلاح استعمال کرکے اِس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے کہ ماقبل نوآبادی عہد میں اقتدار دار زبان کا نفوذ کیسے ہوا۔(۴) گجرات، مالوہ اور دکن کے اطراف میں مسلمانوں کی حکومتیں مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاً سماجی میل جول سے بننے والی مخلوط زبان، جسے سر سید احمد خاں نے ملواں زبان کہا ہے (۱۸۴۹ء) ، (۵) سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر مضبوط ہونے لگی۔فارسیائے ہوئے رسمِ خط کے اقتدار دار ہوجانے کے بعد علاقائی زبانوں کا اپنے اپنے تحریری نظاموں کے ساتھ اب عربی فارسی حروف میں لکھے جانے کی ابتدا ہونا بھی سماجی لسانیات کی دلیل ہے۔

اِس ملواں زبان کے لیے، جسے اِس تحریر میں آئندہ اردو لکھا جائے گا، اور علاقائی زبانوں بولیوں کی مخصوص دیسی اصوات یعنی معکوس (Retroflexion) اور منفوس (Aspiration) اصوات کے لیے بھی، چونکہ عربی فارسی رسمِ خط میں کوئی علامتیں نہ تھیں اِس لیے دکنی مخطوطوں میں اِن آوازوں کی تحریری شخصیت شدید داخلی انتشار کی حامل ہے۔کچھ حروف کے اوپر یا نیچے دو، تین یا چار چار نقطے لگاکر کام چلایا گیا ہے اور بعض لوگ کچھ حروف کی خالی کشتیوں (Dotless Letters) پر چھوٹی افقی لکیر یا لمبی زبر (Small Line: Danda) لگاتے رہے ہیں۔ نونِ غنہ (Nasalization) کو ن کے نقطے بغیر لکھنا بھی اِس دور میں نہیں ملتا۔معکوسیت کے لیے ب اور د کی خالی کشتیوں پر طوطے کی علامت (ط؛ جسے طوئے کہتے ہیں) کے باقاعدہ استعمال کا اوّلین ثبوت ۱۷۷۹ء میں کتابت شدہ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے دیوان مملوکہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے ملتا ہے۔(۶) الغرض یوں اردو کی مخصوص آوازوں کے لیے حروف آہستہ آہستہ متعین ہوتے گئے۔سب سے آخر میں نونِ غنہ اور ہائے دوچشمی کے استعمال میں یکسانی آئی۔

اردو کے حروفِ تہجی (اور دیگر علامتوں) کی معیار بندی اور ترویج کے لیے فورٹ ولیم کالج کا نام اور کردار اِس لیے ناقابلِ فراموش ہے کہ یہ آج کی اصطلاح کے مطابق پہلا ''ریاستی'' ادارہ تھا جس نے یہ کام ایسے انداز میں کیے جن کا اثر دور دور پھیلا۔واضح رہے کہ یہ زمانہ اردو رسمِ خط کی ابتدائی تشکیل کا تھا اور فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اہلِ فن املا و رسمِ خط اور دیگر لسانی تجاویز انفرادی طور پر دیا کرتے تھے کیونکہ نہ تو کوئی ریاست و حکومت مستقل تھی اور نہ ادارے جو ہندوستان میں دور دور پھیلی مختلف راجدھانیوں میں متفرق طور پر کیے جانے والے علمی نوعیت کے کاموں کو کسی ترتیب میں لانے اور اُن میں ایکسارتا لانے کی کوشش کریں۔چنانچہ خوبیِ قسمت سے جس جگہ پر کسی علم دوست حکمران یا علاقے کے چودھری کی مالی اعانت اور رعایا پروری سے کوئی علمی کام ہوگیا، اور دست بردِ زمانہ سے بچ کر آج کسی حال میں ہم تک پہنچ بھی گیا، وہی غنیمت ہے؛ ہر دور کے محققین اِن گنڈے دار کاموں میں پائے جانے والے زمانی خلا (Gap) کو اپنی علمی تحقیقات سے دور کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

*

دنیا کی بیشتر زبانیں آج ابجدی نظامِ تحریر میں لکھی جاتی ہیں اور یہ مفروضہ عام ہوگیا ہے کہ ابجدی نظامِ تحریر تکلم کا نمائندہ ہے۔یہ بات درست نہیں۔اِسی طرح اردو کا نظامِ تحریر بھی تکلم کا نمائندہ نہیں ہے۔دراصل کوئی بھی نظامِ تحریر یا کسی بھی زبان کا رسمِ خط مکمل طور پر صوتی کہلانے کی شرط پر پورا نہیں اترتا۔یہ صرف عالمی صوتی ابجد (International Phonetic Alphabet - IPA) ہے جو لاطینی حروف پر مشتمل ہے اور جو رفتہ رفتہ تمام انسانی زبانوں کی اصوات کی تحریری شخصیت کی نمائندگی کے لیے مصنوعی طور پر تیار کیا گیا ہے۔

رسومِ خط کے بعض قدیم ماہرین اِس قیاسی نظریہ کے قائل تھے کہ تمام رسمِ خط کسی ایک ہی قدیم رسمِ خط سے بنے ہیں تاہم سائنسی تحقیقات اِس پر متفق ہیں کہ تمام ابجدی تحریری نظاموں کا ماخذ سامی الاصل فنیقی (Phoenician) رسمِ خط ہے۔اردو رسمِ خط میں لفظی اور ابجدی تحریر دونوں کی خصوصیات مجتمع ہیں اِس لیے اردو تحریر میں ہر لفظ ایک مستقل فلمچہ (Visual Gestalt) [۷] ہے جس کی صورت متعین ہے خواہ وہ لفظ کی صوتی شخصیت کی مکمل

نمائندگی کرتی ہے یا نہیں۔عربی فارسی کی طرح اردو کے بھی لفظ کی تحریری صورت کو دیکھ کر ہی اُس کی صوتی شخصیت ذہن میں آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو میں لفظوں کی وہ تحریری صورت جس سے آنکھیں مانوس ہوچکیں اور جو چلن میں آچکی ہے اُسی کو برقرار رکھنا اچھا فیصلہ ہے۔اگر ایسا نہ کیا جائے تو پڑھے لکھے لوگ بھی ہجے کرنے والی تعلیمی سطح پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ بات مزید وضاحت سے لکھتا ہوں۔بولی جانے والی زبان کا لفظ عام طور سے حروفِ تہجی کا بامعنی یا بے معنی مجموعہ ہوتا ہے۔اِس مجموعے کو برائے گفتگو ترکیب کہہ لیجیے۔ترکیبوں میں حروف کا ملنا یا نہ ملنا اردو رسمِ خط کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔حروفِ تہجی کے باہم ملنے سے اِن کی مختلف تحریری صورتیں (Allographs) پیدا ہوتی ہیں۔اردو میں بیشتر ترکیبوں میں حروف کی پوری صورت قائم نہیں رہتی بلکہ ہر لفظ کی ایک مستقل بصری صورت بنتی ہے جس میں حروف کی انفرادی صورت کے بجائے لفظوں کی انفرادی صورت قائم ہو جاتی ہے۔یوں اردو رسمِ خط میں ابجدی تحریر کے ساتھ ساتھ لفظی تحریر کی خصوصیات بھی جمع ہوگئی ہیں اور اِس کا ہر لفظ مکمل اور بھرپور فلمچہ بن جاتا ہے۔ اِس فلمچے میں قلم کو بار بار توڑنا نہیں پڑتا اور یہ نہ صرف تحریر کو ایک قسم کی زود نویسی بنا دیتا ہے بلکہ قرات کو بھی آسان بنا دیتا ہے۔اگرچہ نقطوں کی وجہ سے قلم اٹھانا پڑتا ہے لیکن اردو پڑھنے والے لوگ بہت سے نقطوں کو ظاہر کیے بغیر بھی بآسانی تحریر کو پڑھ سکتے ہیں اور لفظ کی مخصوص بصری صورت کی وجہ سے پڑھنے میں نقطوں اور اِعراب کی محتاجی نہیں رہتی۔اردو پڑھنے والے لوگ عربی کے اُس پرانے رسمِ خط کو بھی کسی قدر پڑھ لیتے ہیں جس میں نقطے نہیں ہوتے تھے۔

صوتی سطح پر ہر لفظ ایک صوتی ترکیب (Phonetic Configuration) ہے لیکن جب لفظ کو کسی تحریری نظام مثلاً ابجدی تحریر کے حروفِ تہجی میں لکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ ایک آواز کہاں سے شروع ہوتی اور کہاں پہ ختم ہوتی ہے۔بے معنی جدا جدا صوتی اکائیاں زبان کے لیے خام مواد مہیا کرتی ہیں۔یہی اصوات جب ایک زبان کے صوتیاتی نظام کے تحت باہم ملتی ہیں تو لفظوں کی تشکیل ہوتی ہے۔

اردو سمیت دنیا کی سبھی زبانوں کی ڈکشنریوں میں لفظ کے بعد تلفظ اِسی لیے لکھا ہوتا ہے کہ لفظ تلفظ کا قائم مقام نہیں ہوتا، اور نہ تلفظ لفظ کی جگہ لے سکتا ہے۔لفظ املا کا معاملہ ہے اور تلفظ صوت کا۔اچھی ڈکشنری میں جیسے لفظ کی لکھت کی صورتیں تت سم اور تدبھو دونوں دی جاتی ہیں ویسے ہی تلفظ بھی کئی طرح کا دیا جاسکتا ہے؛ تلفظ رسمی (Formal) اور فصیح (Eloquent) سے لے کر بازاری (Corrupt Pronunciation) تک کئی طرح کا ہوتا ہے۔ اپنی اپنی زبانوں میں تو اِن کی مثالیں عام ہیں، یہاں دخیل/ مستعار لفظ کی مثال لیجیے کہ النشاۃالثانیہ/ النشاۃالثانیہ/ نشاۃ ثانیہ/ نشاتِ ثانیہ وغیرہ تمام تحریری صورتیں مختلف اردو لغات میں موجود ہیں اور تحریر میں مستعمل ہیں، اور اِن کا تلفظ بھی کم سے کم تین طرح کا ملتا ہے: نَشا تے سا نیہ/ نَش اَتے سانیہ/ نَش اَتُس سانیہ، وغیرہ۔اردو اور یہاں کی مقامی زبانوں میں یہ سب تحریری صورتیں اور صوتی ہیئتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں اگرچہ عربی میں اِس کی صرف ایک ہی صورت و صوت درست ہوگی۔

*

اردو حروفِ تہجی کی صحیح تعداد متعین نہیں ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ ماہرینِ اردو کا حرفِ ہجا اور صوتیے (Phoneme) میں فرق نہ کرنا ہے۔گلکرسٹ کے نزدیک اردو حروفِ تہجی کی تعداد ۶۰، پلیٹس کے نزدیک ۳۵، مولوی عبد الحق نے نزدیک ۵۰، وارث سرہندی کے نزدیک ۴۰، شان الحق حقی کے نزدیک ۵۳ جب کہ مقتدرۂ قومی زبان کے نزدیک ۵۴ ہے۔ مولوی عبد القدوس ہاشمی نے اردو حروفِ تہجی کی تعداد سب سے کم یعنی ۳۴ لکھی ہے، خواجہ عبد المجید صاحبِ جامع اللغات اور مرزا خلیل بیگ نے ۳۶، ڈپٹی نذیر احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی نے ۳۸، گوپی چند نارنگ نے ۳۹، فرمان فتح پوری نے ۴۹، ابوالخیر کشفی نے ۵۶، عطش درانی نے ۵۸ جب کہ انشاء اللہ خاں انشاؔ نے سب سے زیادہ یعنی ۸۵ لکھی ہے؛ انشاؔ نے لکھا ہے کہ عوام اور تحقیق سے بے واسطہ لوگ اِس تعداد کو ۹۵ کہتے ہیں۔ (۸)

یہاں یہ بات وضاحت سے لکھتا ہوں کہ میرے نزدیک اردو حروفِ تہجی کی اصولی تعداد ۳۵ ہے یعنی وہ تعداد جو جان ٹی پلیٹس نے فیلڈ ورک اور لسانی تحقیق کی روشنی میں ۱۸۸۴ء میں متعین کی تھی؛ البتہ لکھنے پڑھنے کی استعمالی آسانی کے لیے میں اردو حروفِ تہجی کی تعداد ۳۸

تسلیم کرتا ہوں، یعنی وہ تعداد جسے ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی بے مثال لسانی بصیرت اور عملی ضروریات کے درست اندازے سے اور جنابِ شمس الرحمٰن فاروقی نے سماجی لسانیات کی روشنی میں اردو کے تہذیبی حوالے کے ساتھ حتمی بتایا ہے۔اردو حروفِ تہجی کی یہی تعداد یعنی ۳۸ میں نے ۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والی کارپس کی بنیاد پر تیار کردہ پہلی اردو-انگریزی لغت یعنی Current Corpus-Based Urdu-English Dictionary کے ص-xviii پر ''اردو حروفِ تہجی'' کے تحت شامل کر رکھی ہے۔بحیثیت کمپیوٹر پروفیشنل میں جانتا ہوں کہ سائبر ضروریات اور اردو رسمِ خط کی مشین ریڈ ایبلٹی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے حروفِ تہجی کی متذکرۂ بالا تعداد بالکل کافی ہے اور ہائیہ آوازوں کے لیے مخصوص شکلوں کو الگ حرفِ تہجی کے طور پر گنوانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر کوئی کمپیوٹر پروگرامر کوڈنگ میں ضرورت محسوس کرے تو وہ اُن سب آوازوں کے لیے جو اردو والوں کے منہوں سے نکل رہی ہیں، صوتی شخصیت کے الگ الگ کوڈ مختص کرسکتا/ سکتی ہے، جن کی تعداد اِس وقت ۵۸ بتائی جا رہی ہے؛ کوڈز کی یہ تعداد کسی ایسی جگہ کے اردو بولنے والوں کی ضرورت کے پیشِ نظر مزید بھی بڑھائی جاسکتی ہے جن کے منہوں سے نکلنے والی آوازیں تعداد میں متذکرہ ۵۸ آوازوں سے علاوہ ہوں۔

*

جہاں تک اردو اور ہندی کا تعلق ہے، اختلافِ رسمِ خط کی وجہ سے اب یہ باقاعدہ الگ الگ زبانیں ہیں اور نہ صرف پاکستانی اور ہندوستانی آئینوں بلکہ دنیا کے مقتدر اداروں نے بھی اِن کو الگ زبانوں کی حیثیت سے تسلیم کیا ہوا ہے۔سیاسی حرکیات سے ہٹ کر سماجی اور عصری لسانیات کی روشنی میں دیکھیں تو اردو اور ہندی اِس لیے الگ الگ زبانیں ہیں کہ اِن کے رسومِ خط الگ الگ ہیں۔تاہم اِس میں شک نہیں ہے کہ یہ دونوں زبانیں آپس میں گہرا لسانی اور تہذیبی اشتراک رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی طاقت ہیں۔اِن دونوں زبانوں کے تحریری نظام برِصغیر میں دو بڑی تہذیبوں یعنی ہندی اور اندلمانی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

رومن چونکہ ایک (بلکہ کئی) باقاعدہ زبانوں کا رسمِ خط ہے اِس لیے اردو تحریر یا آوازوں کو رومن حروف میں لکھنا رسمِ خط کی تبدیلی کہلائے گا۔

یہاں اِن دو غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج اور انگریز نے اردو کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا، اور یہ کہ اردو-ہندی لسانی تقسیم فورٹ ولیم کالج کی لسانی پالیسی کا حصہ تھی۔ پہلی بات یہ واضح رہنی چاہیے کہ انگریز وہ پہلا حکمران ہے جس نے ہندوستان (کے اُس تمام حصے میں جس پر اُس کا اقتدار قائم ہوا) میں مقامی زبانوں اور اُن کے رسومِ خط کو سرکاری حیثیت دی ورنہ یہاں دور نزدیک صرف فارسی زبان اور رسمِ خط کا راج تھا۔(اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ فارسی صرف مسلمان حکومتوں مثلاً دہلی اور ریاست بہاول پور وغیرہ کی سرکاری زبان نہ رہی تھی بلکہ مرہٹوں اور سکھوں تک کی حکومتوں نے بھی اپنا لی تھی۔) انگریز نے ہی مقامی زبانوں میں سے اردو کو سرکار دربار کی زبان بنایا اور اِس کے ہندفارسی رسمِ خط کی سرکاری وسائل سے ترویج کی، اور ازاں بعد اُسی نے ہندی زبان اور دیوناگری رسمِ خط کی ترویج و نفاذ کیا۔ یہ بات درست نہیں کہ انگریز نے اردو کو ختم کرکے ہندی کو چلایا۔ دراصل ایک بہت بڑے ملک میں جس میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی، ہندو رعایا کی زبان کو پیچھے رکھنا اکثریتی عوامی رائے عامہ کا استحصال تھا جس کا خطرہ تاجِ برطانیہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ کمپنی حکومت کے خلاف عوامی سرکشی اور غدر کا تجربہ اُس کی تربیت اور اُسے ہر وقت چوکنا رکھنے کے لیے کافی تھا۔ دوسری بات یہ کہ کمپنی حکومت میں گلکرسٹ کے تعصب[۹] نے، تاجِ برطانیہ کا راج براجنے کے بعد پہلی مردم شماری نے، یا پھر سر گریئرسن کے لسانیاتی سروے نے، ہندی کو جو فوائد دیے وہ انگریز کی پالیسی سے زیادہ ہندوؤں کی موقع پرستی اور وقت پر درست فیصلوں کا نتیجہ تھے۔ مثال لیجیے کہ ہندو ۱۸۲۴ء سے چپکے چپکے انگریزی تعلیم کے حصول میں باقاعدہ مشغول تھے جب کہ مسلمان اُس وقت بھی انگریزی کے خلاف مذہبی دلائل سے لیس تقریریں کرتے پھرتے تھے [۱۰] جب نصف صدی بعد انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ملازمتیں ملنا عام ہوا۔ وغیرہ۔ الغرض یہ بات بالکل درست ہے کہ مسلمانوں کی افرادی، سماجی، معاشی اور حربی قوت کو تہس نہس کرنا انگریز کا منصوبہ تھا اور جو مسلمان ۱۸۵۷ء کے کیفرِ غدر کو بھگت رہے تھے اُن کا کوئی فائدہ کرنا یا اُن کی کسی چیز کی پرورش کرنا انگریز کی پالیسی ہوسکتی ہی نہیں تھی، لیکن سبھی خرابیوں کی واحد وجہ انگریز یا ہندو نہ تھا بلکہ اِن میں بہت کچھ ہاتھ مسلمانوں کی اپنی بدتدبیری اور عاقبت نااندیشی کا بھی تھا۔ یہ جو اردو یا ہندی اور

دیگر مقامی زبانوں اور اُن کے رسومِ خط کو انگریز سے فائدہ ہوا ہے، اور پہلے اردو اور پھر ہندی سرکار دربار کی زبان بنی، یہ ہندوؤں کی معاشی، سماجی اور سیاسی حیثیت داری کی وجہ سے بنی ہے۔یہ حیثیت داری کے وہ اشاریے (Pointers) ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں نے ہندوستان میں صدیوں بادشاہت کی ہے۔

انگریز کی لسانی پالیسی میں زبان اور رسمِ خط دونوں ہم وزن ہیں اور اِسے سمجھنے کے لیے مثلاً یہ مطالعہ مفید ہوسکتا ہے کہ سرسید نے پنجاب یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی اور ٹیکنکل ایجوکیشن کی شدید مخالفت کیوں کی تھی اور انگریز ہندوستانیوں کو یونیورسٹیوں میں السنۂ شرقیہ پڑھانے کا سنہری جال بچھا کر دراصل کیسے اُن کا استحصال کرنا چاہ رہا تھا۔وغیرہ۔نوآبادی دور میں اِن ذکر کردہ مواقع پر سر سید کے لکھے مضامین اِس قدر اہمیت کے حامل تھے کہ یہ انگریزی میں ترجمہ ہوکر برطانیہ میں شائع ہوتے رہے اور اِن پر خوب گفتگو ہوتی رہی، نیز یہ کتابچوں کی صورت میں بھی شائع [11] ہوئے۔وائسرائے کی انتظامیہ کے یونیورسٹیوں سے متعلق تعلیمی پالیسی میں تبدیلی لانے میں اِن مضامین کا بھی کردار ہے۔

یہ مضمون چونکہ صرف دائیں سے بائیں لکھی جانے والی اردو کے اعتبار سے لکھا گیا ہے اِس لیے اِس میں ہندوستان میں پنپنے والے کھروشٹی (Kharosthi) رسمِ خط اور وسیع جغرافیوں پر پھیلے برہمی (Brahmic) رسمِ خط (نیز گرمکھی اور دیوناگری) کے بارے میں کچھ معلومات نہیں دی گئیں، جو بجائے خود تفصیلی مطالعہ چاہتی ہیں۔اِن کا مختصر ترین تعارف ڈاکٹر فائزہ بٹ کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> ”کھروشٹی رسم الخط دائیں جانب سے بائیں جانب کو لکھا جاتا ہے۔یہ ہندوستان کے شمال مغرب میں رائج تھا جب کہ براہمی رسم الخط بائیں جانب سے دائیں جانب کو لکھا جاتا ہے۔ہندوستان کے ایک بڑے خطّے میں یہی رسم الخط رائج تھا“۔ [12]

البتہ یہ ضرور عرض کر دیتا ہوں کہ میرے نزدیک آج کی اردو کا تعلق عرب، عربی اور اسلام سے جوڑنا کم کوشوں کی ایک خوش گمانی اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے لازمی ردِعمل کے سوا کچھ نہیں ہے، اور یہ ردِعمل دیوناگری کی صورت میں اب سیاسی طور پر تناور

ہوچکا ہے۔دائیں سے بائیں لکھنے والے رسومِ خط کی تاریخ آدمِ قرآنی اور طواف و حج سے کہیں قدیم ہے۔عربی اسلام کی آمد سے بہت پہلے سے ایک توانا زبان بن چکی تھی جس کا تخلیقی ادب اپنی معراج کو پہنچا ہوا تھا اور جس کے نمونے عبادت گاہوں میں فخر سے لٹکائے جاتے تھے تبھی خدا نے اپنی آخری وحی کو ادبی و لسانی معراج پر پہنچی اِس زبان میں اتارا۔یہ زبان اور یہ رسمِ خط تجارتی راستوں سے ہندوستان میں آنے لوگ پہلے سے استعمال کر رہے تھے، اور استعمال اِس لیے کر رہے تھے کہ یہ یہاں کے لوگوں کی اپنی چیز تھا اور اِس لیے اِن کے واسطے اجنبی نہ تھا۔

*

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ تحریر، رسمِ خط، املا اور درست املا کے ساتھ ساتھ یہاں لفظ، حرفِ تہجی، کلمہ، ڈکشنری لفظ اور سرلفظ کی مناسب تعریف بھی دے دی جائے تاکہ اِن میں کے فرق کی وضاحت ہوجائے۔

- **تحریری نظام (Writing System)** وہ اصول ہوتے ہیں جن کے تحت کسی زبان کے الفاظ اور جملے روایتی تصویری نشانات و علامات کے ذریعے محفوظ کیے جاتے ہیں۔ اِس کی تین بڑی اقسام ہیں: لفظی تحریر (Logographic)، رکنی تحریر (Syllabic)، ابجدی تحریر (Alphabetical)۔

- **رسمِ خط (Script)** اُن روایتی تصویری نشانات و علامات کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی تحریری نظام کے عناصر کو آنکھوں سے دیکھنے یا مشین کے لیے قابلِ فہم بنانے کے لیے بنایا گیا ہو۔

- **حروفِ تہجی (Alphabet)** مقررہ ترتیب میں وہ نشانات یا علامتیں ہوتی ہیں جو کسی زبان والے اپنی ابجدی تحریر کے لیے بطور کسی بنیادی آواز کا نمائندہ یا لفظ کے مادّے (Etymology/Root) کا حصہ تسلیم کرلیں۔ابجدی کا لفظ یہاں مرادی معنی میں ہے جس سے مراد Abecedarian ترتیب ہے۔

- **املا (Orthograph)** ابجدی تحریر میں لفظوں کی تصویر کشی یا تصویری شخصیت کو کہتے ہیں۔املا غلط ہو یا درست، بہرحال املا ہوتا ہے۔درست املا لفظوں کی وہ تصویری شخصیت ہے جو زبان کے قدیم و جدید ذخیرۂ الفاظ میں موجود ہو، تاہم ضروری نہیں کہ یہ تمام تصویری شخصیتیں زبان کے لغات میں بھی موجود ہوں۔

- **لفظ (Word)** ابجدی تحریر کے حروفِ تہجی کا وہ مجموعہ ہوتا ہے جو کسی بامعنی یا بے معنی انسانی یا غیر انسانی آواز کی نمائندہ تحریری شخصیت ہو۔یاد رہے کہ جیسے ہر تصویرچہ (Grapheme) یا صوتیہ (Phoneme) کا حرفِ تہجی ہونا ضروری نہیں ویسے ہی ہر لغویہ (Lexeme) کا "لفظ" (Lexical Item/ Dictionary Word) ہونا ضروری نہیں ہے۔

- **کلمہ** لفظ کی صوتی شخصیت کو کلمہ کہتے ہیں۔چنانچہ یہاں برائے گفتگو کلمہ اور لفظ کو باہم مترادف سمجھ لیا جائے۔تحریر میں کلموں کو الگ الگ لکھنا چاہیے تاہم اردو، فارسی اور عربی میں حروفِ تہجی کو جوڑ کر بنے کلمے اور بعضے کلموں کو جوڑ کر بنی ہوئی صورتیں، جنھیں اوپر فلمچہ بتایا گیا ہے، صدیوں کی تاریخ رکھتی ہیں اِس لیے اُنھیں تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔رومن حروفِ تہجی والے رسومِ خط میں لکھی تحریروں میں حروف چونکہ اپنی اپنی انفرادی شناخت برقرار رکھتے ہیں اِس لیے اُن میں لفظوں کے ساتھ عموماً یہ مسئلہ نہیں ہے۔

- **سرلفظ/ لغوی اندراج (Main Entry)** یہ سادہ ترین الفاظ میں اُس اندراج کو کہتے ہیں جو کسی زبان کے عام لغت (General Dictionay) میں موجود ہو۔یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ڈکشنری لفظ (Lexical Item/ Dictionary Word) کو زبان کے بولنے والے اُس کی خالص ڈکشنری صورت میں لکھتے یا بولتے بھی ہوں۔زبانوں پر اور لکھت میں ڈکشنری لفظوں کی تصریفی صورتیں ہوا کرتی ہیں۔

[مندرجۂ بالا تعریفات راقم نے ۵/ فروری ۲۰۰۴ء کو ایک ای میل بنام شان الحق حقی اور شمس الرحمٰن فاروقی میں برائے ملاحظہ و تصحیح بھیجی تھیں جن کا ملخص یہاں پیش کیا گیا ہے۔]

***

(۲)

اب آیئے شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے رسالے رسم الخط یعنی قواعدِ اِملا و اِنشائے خطِ عربی و فارسی و اردو کی طرف۔اِس رسالے کے بارے میں راقم نے ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی: کچھ اُن کی کچھ میری زبانی کے محقّق ایڈیشن (۲۰۲۰ء؛ بک کارنر جہلم) کے ابتدائیے ''معروض'' میں لکھا تھا:

[مولوی] نذیر احمد کے ۳۲ صفحی رسالے رسم الخط یعنی قواعدِ اِملا و اِنشائے خطِ عربی و فارسی و اردو کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو رسم الخط اور اِس کی لکھاوٹی باریکیوں کا حیرت ناک حد تک درست سائنسی شعور رکھتے تھے اور اُنھوں نے اُس دور میں اپنے رسالے کو صوت سے الگ کرکے صورت تک محدود رکھا جب اردو قاعدہ پڑھانے کا بڑا مقصد ہی عربی حروف کی مخارج سے ادائیگی کی مشق ہوتا تھا۔یہ رسالہ اردو حروفِ تہجی کو وِند اور اوِندوا (نقطہ دار اور غیر منقوط) میں تقسیم کرنے یعنی نقطوں اور حروف کی خالی کشتیوں کو الگ الگ کرکے لکھنے کی پہلی دستاویز ہے جس کی حتمی شکل آج سائبر دور میں مشین ریڈ ایبل اردو کی صورت میں ہر اُس شخص کے ہاتھ میں موجود ہے جو اپنے کمپیوٹر یا موبائل فون میں اردو کا ہندفارسی رسم الخط لکھتا یا پڑھتا ہے۔بطور ''رہنمائے اساتذہ'' لکھا اور ۱۸۷۷ء میں پہلی بار شائع ہونے والا یہ رسالہ اردو املا اور لکھاوٹ کی ساخت پر کسی دیسی ہندوستانی کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے اور اِس میں اصول و قواعد سازی کے ساتھ ساتھ ایسی برمحل اصطلاحات اور لفظیں گھڑی ملتی ہیں جو آج ڈیڑھ سو سال بعد بھی اردو کی علمیات (Body of Knowledge- BoK) میں مستعمل

ہیں جیسے ترکیبِ سابق، ترکیبِ لاحق اور ترکیبِ طرفین۔وغیرہ۔[ص-۳۱-۳۲، باندک تصرف]

رسالے کے عمومی تعارف کی حد تک مندرجۂ بالا سطور کافی ہیں تاہم یہاں کچھ اور تفصیلات لکھتا ہوں۔ڈپٹی نذیر احمد کا رسالہ، جسے اِس تحریر میں آئندہ مختصراً رسم الخط لکھا جائے گا، دوسری بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔میرے سامنے اِس کا وہ ایڈیشن ہے جو محمد مقتدیٰ خاں شیروانی کے زیرِ اہتمام ۱۹۱۹ء میں مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج میں پانچویں بار طبع ہوا۔یہ غالباً اِس کا تیسرا ایڈیشن ہے (یا پہلے ایڈیشن کی پانچویں طباعت ہے)۔یہ رسالہ اپنے موضوع پر اوّلین باضابطہ مستقل اشاعت ہے۔اِس رسالے کا عکس انجمنِ ترقیِ اردو ہند سے اسلم پرویز نے ۲۰۱۲ء میں مولوی نذیر احمد کی چار نایاب مطبوعات میں شائع کیا ہے لیکن اِس کے "دیباچہ" میں نیز اِس پر ڈاکٹر خلیق انجم کے "حرفِ آغاز" میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ کون سا ایڈیشن ہے۔اُنھوں نے ص-۶ پر صرف اِتنا لکھا ہے کہ ''پچھلے دنوں مولوی نذیر احمد کے چار مطبوعہ رسالے کسی طرح ہماری دسترس میں آگئے۔''

آگے بڑھنے سے پہلے رسم الخط کے موضوع کے بارے میں ذہن صاف کرنے کی ضرورت ہے۔اِس رسالے کا بنیادی موضوع املا و خوش نویسی ہے نہ کہ رسمِ خط، اور ڈپٹی صاحب نے رسمِ خط سے مراد Drawing of the Writing یعنی Calligraphy یا Handwritten Lettering لیا ہے نہ کہ Script۔اِس بارے میں ۲/ فروری ۲۰۰۴ء کو ڈاکٹر اسلم فرخی سے بات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ ڈپٹی صاحب نے اپنے رسالے کا نام رسم الخط سکرپٹ کے معنی میں نہیں لکھا کیونکہ اِس میں رسمِ خط نہیں بلکہ تحریر و املا کے طریقے اور مسائل بیان کیے گئے ہیں، اور غالباً اِس کی وجہ یہ تھی کہ جن دنوں یہ رسالہ لکھا گیا وہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں ہندوؤں نے اپنی زبان کے رسمِ خط کے لیے اردو کے مقابلے میں سیاسی تحریک اٹھا دی تھی۔مسلمان اپنی غدر والی شکست خوردگی، سیاسی بے حیثیتی، معاشی بدحالی، ہندوؤں کی سرکار دربار میں رسائی اور ساکھ نیز اُن کی کئی گنا زیادہ تعداد کی وجہ سے مستقل دباؤ میں تھے، اور اِس سیاسی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے جو بن پڑتا تھا کرتے تھے۔حد یہ ہے کہ سرسید جیسا خالص سیکولر ہندوستانی بھی ایک دن اردو کو ''مسلمانوں کی

زبان'' کہنے پہ مجبور ہوگیا تھا حالانکہ مسئلہ زبان کا نہیں رسمِ خط کا تھا، اگرچہ بعد کے حالات نے یہی ثابت کیا کہ سر سید کی پالیسی درست تھی اور اردو اور ہندی کا آپسی تنازع ایک طرح سے لسانیاتی میکسکن سٹینڈآف (Mexican standoff) پر پہنچ چکا تھا۔الغرض اپنے رسالے میں ڈپٹی صاحب نے املا (Orthography) کو کہیں کتابت/ تحریر (Writing)، کہیں خوش نویسی (Calligraphy) اور کہیں بول کر لکھوانے (Dictation) کے معنی میں لیا ہے۔ڈاکٹر فرخی نے مجھ سے اتفاق کیا تھا۔

تاہم اِس معاملے کو ایک اور زاویۂ نظر سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔جس دور میں یہ رسالہ لکھا گیا اُس وقت ''املا'' کا لفظ ''الفاظ یا عبارت بول کر لکھوانے کا عمل'' کے معنی میں استعمال ہونے لگا تھا جس کی پہلی تحریری سند ۱۸۸۶ء کی ہے۔[رک: اردو لغت (تاریخی اصول پر)؛ جلد اوّل، ص-۸۵۲] چنانچہ ''رسم الخط'' کی ترکیب ابھی ''املا'' کی ویسے مترادف سمجھی جاتی تھی جیسے آج مثلاً دین اور مذہب باہم مترادف لکھ اور بول لیے جاتے ہیں۔تاہم لغت دیکھتے ہوئے یہ سہو نظر پڑا کہ سند پڑھ کر کارڈ بنانے والے کارڈ نویس نے ''رسم الخط'' کی ترکیب کی اوّلین سند ۱۸۸۰ء کی آبِ حیات سے دی ہے [ملاحظہ ہو اردو لغت (تاریخی اصول پر)؛ جلد دہم، ص-۶۰۶] جب کہ ڈپٹی صاحب کا رسالۂ مذکور ۱۸۷۷ء میں شائع ہوچکا تھا۔اردو لغت بورڈ کو اگلے ایڈیشن میں اوّلین سند میں اِس رسالے کا نام داخل کرکے درستی کرنی چاہیے۔

رسم الخط کے مندرجات سے بالکل واضح ہے کہ اِس رسالے کا مقصد مبتدیوں کو نیز اُن کے اساتذہ کو اردو لکھاوٹ کے اصول سکھانا اور مشق بہم کرنا ہے نہ کہ رسمِ خط کی سیاست یا سائنس سے آگاہ کرنا، اور نہ اِس میں نظامِ تحریر کا کچھ ذکر مذکور ہے۔رسالے میں مختلف مشقی تختیوں میں ایک ہی حرفِ تہجی کی لکھاوٹ کی کئی کئی شکلیں دکھائی گئی ہیں جو لکھنے والوں کے ہاں چلن میں تھیں/ ہیں۔چنانچہ اِس رسالے پر مثلاً یہ اعتراض نہیں بنتا کہ فلاں حرفِ تہجی اِس میں شامل ہے اور فلاں نہیں، یا فلاں حرف کی فلاں صورت کیوں شامل ہے۔مثال لیجیے کہ اگر اِس میں ڑ کا حرف شامل نہیں ہے تو اِس کی یہی وجہ کافی ہے کہ یہ حرف ر کی خالی کشتی پر لگے تین نقاط ہیں۔ملاحظہ کیجیے یونیکوڈ کوڈ چارٹ Arabic Glyph Parts 0880 کے اندر

0880 تا 0889، 008 A تا 088 F اور 0890 تا 0895۔اِسی طرح رسالے کی تختیوں میں اگر کہیں شوشوں والا ش اور لمبی کشش والا ش الگ الگ دکھائے گئے ہیں تو اِس کی وجہ بھی لکھاوٹ کی ایک چلن دار صورت کا سمجھانا ہے۔بالکل یہی وجہ ک اور کہ کی ہے۔وغیرہ۔

تاہم اسلم پرویز صاحب کی مرتّبہ متذکرۂ بالا کتاب میں جناب محمد ذاکر نے اپنے ابتدایئے میں لکھا ہے کہ:

> ''[ڈپٹی نذیر احمد نے] ترکیبِ لاحق میں نہ آنے والے یعنی اپنے آگے کے حرف سے نہ ملنے والے حروف آٹھ قرار دیے ہیں، اِس میں سہواً ژ رہ گیا ہے۔یہ حقیقت میں نو (۹) ہیں''۔ (۱۳)

نیز واضح رہے کہ اردو میں [ژ] کی آواز چند فارسی اور انگریزی کے مستعار الفاظ تک ہی محدود ہے جیسے ژال (فارسی) یا رژیم (انگریزی) وغیرہ، چنانچہ اِن الفاظ میں اگر [ژ] کی آواز کو /ز/ سے بولا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، تو معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی؛ اورچونکہ [ژ] اور /ز/ کی آوازوں کا کوئی اقلی جوڑا (Minimal Pair) بھی دستیاب نہیں ہے اِس لیے [ژ] کو صرف تحدیدی فونیم (Restricted/Marginal Phoneme) مانا جاسکتا ہے۔عالمی صوتی ابجد (IPA) میں ذیلی فونیم کو [ ] میں اور فونیم کو / / میں لکھتے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے فرق کیا جاسکے۔

رسم الخط کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد اردو حروفِ تہجی کو حروف کی خالی کشتیوں اور نقطوں میں تقسیم کرنے کے نظریے یعنی Ghost Character Theory (GCT) کے بنیاد گزار ہیں۔اُن سے پہلے اردو حروفِ تہجی کی یہ والی تقسیم کسی مصنف کے ہاں نہیں ملتی کیونکہ اُن کا رسالہ اِس موضوع پر اردو میں پہلی باضابطہ مستقل تصنیف ہے۔

تاہم یہاں اِس بات کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ عنایت خان راسخ (پ: 3-1702ء) نے اپنے فارسی رسالے کارستان کے دیباچے میں لکھا ہے اُس نے اِس سے قبل (یعنی ۱۷۵۱ء سے قبل) ہندی کبت پر مشتمل ایک تصنیف سدھا سروور تالیف کی تھی جس میں مثالیں بھاکھا برج زبان کے اشعار میں تھیں۔راسخ موسیقی دان تھا اور درست تلفظ کی اہمیت سے بخوبی واقف، اِس لیے اُس نے بھاکھا زبان کے تلفظ کی درست ادائیگی کے لیے بعض اِعراب وضع

کیے اور ہندی حروفِ تہجی میں سے مثلاً ٹ کے لیے ت کے اوپر چار نقطے لگانے کی پہلے سے چلتی آتی تجویز کی تائید کی؛ ڈاکٹر عارف نوشاہی اور شاہدہ عالم نے مجلہ بازیافت (شمارہ-۴) میں لکھا ہے کہ اُس دور میں بعض اور لوگ بھی یہ تجاویز دے رہے تھے۔[۱۴] راقم کی معلومات کے مطابق تصنیف سدھا سرور ابھی تک دریافت نہیں ہوسکی چنانچہ راسخؔ کے بیان کی تفصیل یا تنقیدی جائزہ لینے کی کوئی سبیل تاحال موجود نہیں ہے، نیز ڈاکٹر عارف نوشاہی اور شاہدہ عالم کے ریسرچ پیپروں سے متبادر ہوتا ہے کہ رسالہ کارستان میں بنیادی طور پر زبان (یعنی الفاظ) کے درست تلفظ کے لیے تجاویز تھیں نہ کہ اِس میں ہندی حروفِ تہجی کو خالی کشتیوں اور نقطوں کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تھا۔صحتِ زبان کا درد اور ذوق رکھنے والے اہلِ فن کی تحریروں میں اِس قسم کی تجاویز کثرت سے ملتی ہیں۔

رسم الخط میں حروفِ تہجی کو وِند اور اوِندوا میں تقسیم کرنے کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور اردو میں بھی تقسیم کیا گیا ہے تاکہ نہ صرف مبتدی بلکہ اساتذہ بھی اِن سے بننے والے الفاظ کے بارے میں جان سکیں کہ کون سا لفظ کس زبان کا ہے۔نیز ڈپٹی صاحب ہوا کا رخ پہچان گئے تھے کہ آئندہ فارسی کے بجائے انگریزی کا چلن ہوگا اِس لیے اُنھوں نے اُس دور میں یہ رمز پا لی تھی کہ /z/ کی آواز کے لیے اردو، ہندی اور انگریزی الفاظ میں ہمیشہ ز لکھی جائے گی جب ابھی کسی ماہرِزبان کا اِس طرف کو دھیان بھی نہ گیا تھا۔اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

"چونکہ ذ، ض، ظ عربی سے مخصوص ہیں، ضرور ہے کہ لفظ گزر میں ز ہوگی"۔ (۱۵)

یہی وہ بات ہے جسے ازاں بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے صوتیاتی جدول میں عربی کی دوہری آوازوں یعنی ہم صوت حروف کی عدم شمولیت کی بات کرتے ہوئے بایں الفاظ لکھا تھا:

> صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جسے اردو رسمِ خط اٹھائے ہوئے ہے صرف اِس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔ (۱۶)

غور کیجیے کہ ڈپٹی صاحب آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے گزر کو ز کے ساتھ لکھنا درست بتا رہے ہیں اور ذ سے لکھنا غلط، یعنی اُس بے وجہ بحث سے طلبہ و اساتذہ کو بچا رہے ہیں جس پر ازاں بعد بہت قیل و قال کیا گیا ہے، اور نتیجہ وہی رہا ہے جو ڈپٹی صاحب نے بتا دیا ہے۔

الغرض ڈپٹی صاحب کے نزدیک گزر، گزرنا، گزارنا، گزرا، گزر جانا، گزار دینا، گزارا/ گزارہ، گزر بسر، گزرانا، گزارش، گزشتہ، مال گزاری، وغیرہ، اِس لیے درست ہیں کہ یہ اردو/ فارسی کے مصادر سے مشتق ہیں۔چنانچہ اِس طرح اُنھوں نے اردو لکھنے والوں کو گذر، گذار، گذارش وغیرہ کی بے ثمر ذہنی ورزش سے بچا لیا ہے۔اصولی بات ہے کہ دائن زبان کا لفظ حصولی زبان کے حروفِ تہجی میں لکھا جائے گا؛ اِسی اصول پر قرآن میں موجود سنسکرت الفاظ کا املا عربی کی قریب ترین آوازوں والے حروفِ تہجی میں تبدیل کرکے لکھا گیا ہے، اور اِسی طرح عربی والے کراچی کو کراتشی اور چاڈ کو تشاد کہتے ہیں۔وغیرہ۔

رسم الخط میں ڈپٹی صاحب لکھائی کی مشقوں میں ایسے الفاظ لائے ہیں جن سے اساتذہ کو اُن کے معنی بتانا پڑیں اور طلبہ کو ہم آواز لیکن مختلف الاملا لفظوں (Homophones) میں فرق معلوم ہوسکے۔مثال لیجیے کہ ''قواعد متعلقۂ ترکیبِ لاحق'' کے تحت ''قاعدۂ اوّل'' میں دی گئی مشقی فہرست میں وہ اذل کا لفظ لائے ہیں۔استاد یہاں ازخود اذل اور ازل میں فرق بتانے پر مجبور ہوگا۔تعلیمی نفسیات کا یہ شاندار حربہ نہ صرف طلبہ کو سبق میں محو رکھتا ہے بلکہ استاد کو مطالعے اور سمجھانے کی کاوش پر بھی آمادہ کرنے والا ہے۔

تاہم اِس رسالے میں پذیرا کا بحث آفریں لفظ موجود نہیں ہے تاکہ اِس کے بارے میں ڈپٹی صاحب کی رائے معلوم ہوجاتی۔غالب گمان ہے کہ پذیرا کی مثال نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے حینِ حیات ابھی غالبؔ کے املا کا قضیہ کھڑا نہ ہوا تھا۔

ذ اور ز کی مندرجۂ بالا بحث سے البتہ یہ نتیجہ نہ نکال لیا جائے کہ ڈپٹی صاحب لفظوں کو اُن کی اصل سے اکھاڑ کر گملے کا پھول بنا دیتے ہیں اور اردوئیت کے چکر میں اُن کے اشتقاق (Etymology) کا خون کر دیتے ہیں۔خوب یاد رہے کہ لفظوں کے معاملے میں ڈپٹی صاحب نہایت خالصہ قسم کے ''خالص پسند'' ہیں یعنی تت سم کے دلدادہ ہیں۔مثلاً یہ جاننے کے لیے کہ وہ الفِ مقصورہ کو الف سے بدل کر بصارتوں سے قدیمی آشنا لفظوں کو شکل سے بے شکل بنانے کے رویے پر کیا اصولی موقف رکھتے ہیں، اُن کے مندرجۂ ذیل اقتباس میں خط کشیدہ عبارت دیکھیے:

بعض الفاظِ عربی فصیح اردو میں مستعمل ہوتے ہیں جن کی کتابت خلافِ تلفظ ہے جیسے ایضًا، جبراً، قہراً، طوعًا، کرہًا، اشارۃً، کنایۃً، حتی الوسع، حتی الامکان، حتی المقدور، موسیٰ، عیسیٰ، یحییٰ، مصطفیٰ، مرتضیٰ، مجتبیٰ، اللہ تعالیٰ، عبد الرحیم، عبد الغنی، عبد الصمد، عبد الستار، فرید الدین، محی الدین، ابو الفضل، ابو الحسن۔اِن الفاظ کا طریقۂ تحریر بھی یاد کرلینا مفید ہے۔(۱۷)

چنانچہ ڈپٹی صاحب خلافِ تلفظ کتابت والے الفاظ کی اِس چھوٹی سی فہرست کی روشِ کتابت کو بجنسہٖ یاد رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں بجائے اِس کے کہ ''جیسا بولو ویسا لکھو'' کے نعرے کے پیچھے لگ کر معروف لفظوں کو کسی قانون کی بھینٹ چڑھا کر اجنبی صورت میں لکھا جائے۔

رسم الخط کی اصل غایت حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کا ڈھنگ سکھانا ہے کیونکہ لفظی اور ابجدی دونوں طرح کے نظامہائے تحریر کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اردو تحریر کا ہر لفظ ایک مستقل فلمچے کے طور پر شناخت ہوتا ہے۔رسالے میں ڈپٹی صاحب نے حروف کو جوڑنے کے جو قواعد ترکیبِ سابق، ترکیبِ لاحق اور ترکیبِ طرفین کے تحت بیان کیے ہیں اور اِس کے لیے اصطلاحات گھڑی ہیں، اردو املا و تحریر کی تاریخ میں یہ اوّلین نقش ہے۔اِس کوشش کا اختتام اُنھوں نے ''ایک کلمے کو دوسرے کلمے سے ہمیشہ جدا لکھنا ہوگا'' کا اصول بتانے کے بعد اِس معلومات پر کیا ہے کہ:

''عبارت لکھنے میں جب ایک کلمہ تمام ہوا اُس کی ترکیب بھی تمام ہوئی، دوسرا کلمہ شروع ہوا تو دوسری ترکیب شروع ہوئی۔پس ترکیب ہر ایک کلمے کے ساتھ شروع ہوتی اور اُسی کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔یعنی کلمے کلمے کی شناخت اور اُن کا امتیاز بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ایک کلمے کے دو یا زیادہ ٹکڑے کرنے کی غلطی تو شاذ و نادر ہوتی ہے بلکہ نہیں ہوتی مگر دو کلموں کو یک جا کرنے کی غلطی ایسی عام ہے کہ شاذ و نادر کوئی اِس سے بچا ہوگا''۔ (۱۸)

اِس کے بعد وہ یہ قاعدہ بتاتے ہیں کہ ''ہر ایک کلمے کا حرفِ آخر ہمیشہ پورا لکھا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ختم ہوا۔'' اِس باب کا اختتام وہ کلمے کا حرفِ آخر پورا نہ لکھنے کی وجہ سے ہونے والے ''اجشبکو''، ''آجدنسے'' اور ''کلدنسے'' قسم کی گھسیٹ خط والی بے سوادیوں سے بچنے کی مشقیں فراہم کرکے کرتے ہیں۔انتہائی توجہ سے ڈیزائن کی گئی یہ مشقیں اُن کے فنِ املا و خطاطی پر دسترس اور تعلیمی نفسیات سے آگاہی کا نقطۂ عروج ہیں۔

رسم الخط کے مندرجات اور لکھائی کی مشقوں میں دیے گئے الفاظ کے بارے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ڈپٹی صاحب نے اپنے رسالے کو ہر لحاظ سے سیکولر رکھا ہے تاکہ کسی بھی مذہب کا استاد اِسے پڑھا سکے اور کسی بھی مذہب کا طالبِ علم اِسے پڑھ سکے۔مثال لیجیے کہ بعض ناموں کے ہجے سکھانے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور انگریزوں کے نام بھی لکھے گئے ہیں تاکہ غیریت دور ہوسکے۔

اِس رسالے میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو آج چلن میں نہیں ہیں یا جدید لسانیات میں اُن کی تعریف (Definition) مختلف ہوگئی ہے۔اوّل الذکر کی ایک مثال یائے ماقبل مفتوح کی کتابت کے لیے نصف دائرے کی روش یعنی کٹی ہوئی ی کا استعمال ہے اور آخر الذکر کی ایک مثال متشابہ آوازوں کے لیے علمِ تجوید کی اصطلاحات سے مخارج کا لفظ لانا۔لیکن اِن سے کوئی فرسودگی در نہیں آتی کیونکہ پہلی مثال اُس دور کی لکھاوٹ میں ایک چلن دار روش کی ہے جب کہ دوسری مثال اُس دور کی سماجی لسانیات کی رو سے بالکل درست تھی کیونکہ اردو قاعدہ پڑھانے کا بڑا مقصد ہی عربی حروف کی مخارج سے ادائیگی کی مشق ہوتا تھا۔

ایک قابل ماہرِ تعلیمی نفسیات کی طرح ڈپٹی صاحب ہر چیز یا خیال کی تعریف (Definition) کو بالکل سامنے کے الفاظ میں سمجھاتے ہیں اور پھر اُس پر گفتگو کرتے ہیں، یا پھر پوری بات سمجھا کر آخر میں اُس گفتگو کو اُس چیز/ خیال کی تعریف میں سمو دیتے ہیں۔مثال لیجیے کہ اُنھوں نے کلمہ/ لفظ کی تعریف بایں الفاظ کی ہے:

> ”جتنے حرفوں سے ایک معنی سمجھ میں آ جائیں، خواہ کسی شخص یا چیز یا کام یا حالت کا نام ہو، خواہ کسی کام یا حالت کے وقوع کی حکایت، یا ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے ربط دیتے ہوں، وہ سب حرف ایک کلمہ یا ایک لفظ ہیں“۔ (۱۹)

یہ تعریف، میری رائے میں، نامکمل ہے کیونکہ کلمہ/ لفظ بے معنی بھی ہوسکتا ہے۔ممکن ہے کہ پہلے ایڈیشن میں یہ تعریف مکمل ہو اور موجودہ ایڈیشن میں یہ حصہ کتابت ہونے سے رہ گیا ہو۔میری رائے میں ڈپٹی صاحب سے ایسا سہو ہونا ممکن نہیں کیونکہ اِس رسالے کے دو

ایڈیشن تو اُن کی زندگی میں ہی نکل چکے تھے؛ دوسرا ایڈیشن وہ والا بنتا ہے جس میں اپنے ''دیباچہ'' کے نیچے اُنھوں نے ۱۹۱۲ء لکھ رکھا ہے۔

رسم الخط میں کئی اصطلاحات ایسی ہیں جن کو سمجھنے کے لیے آج ذرا زیادہ کاوش درکار ہوتی ہے کیونکہ یہ متن ڈیڑھ صدی پرانا ہے۔اِس کی ایک مثال ہمزہ ہے، جو ڈپٹی صاحب کے نزدیک ''حرفِ مستقل'' نہیں ہے۔واضح رہے کہ یہاں حرفِ مستقل کو حرفِ تہجی کا مترادف نہیں کہا گیا کیونکہ اِس پر جو بحث کی گئی ہے وہ ہمزہ کی کرسی کی ہے نہ کہ حرفِ ہجا کی۔ڈپٹی صاحب کے نزدیک ہمزہ اپنی مختلف شکلوں (کرسی پر نشستوں) سمیت اردو حروفِ تہجی میں سے ایک حرف ہے۔

اِس مختصر سے رسالے کے کمالات کی لمبی فہرست ہے جسے اِس امید پر موقوف کر رہا ہوں کہ اہلِ نظر خود کاوش کرکے اِسے مکمل کرلیں۔

***

اب رسم الخط کے ایڈیشن ۲۰۲۱ء کی تدوینِ متن کے لیے اختیار کیے گئے اسلوب پر ایک سرسری نظر۔سب سے پہلی بات یہ کہ رسم الخط کے اِس ایڈیشن کے بارے میں یہ دعویٰ باطمینان کیا جا سکتا ہے کہ اِس میں پرانا املا بدلا گیا ہے نہ کہ الفاظ۔مثال لیجیے کہ ابتدا، انخا وغیرہ کو ہمزہ کے بغیر لکھا اور کٹی ہوئی ی کو بڑی ے سے بدل دیا گیا ہے۔دوسری بات یہ کہ اصولی طور پر پوری کتاب کے املا میں یکرہی و یکسانی ہونی چاہیے لیکن یہاں ایسا نہیں ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اِس متن میں کتابت کے مختلف انداز سکھائے گئے ہیں جن کا بجنسہٖ لکھا جانا ضروری تھا۔تیسری بات یہ کہ ڈپٹی صاحب نے دو کلموں کو یکجا کرنے کی غلطی سے آگاہ کیا ہے لیکن کاتب نے کئی جگہ پر کلمے جوڑ رکھے ہیں، مثلاً: نہوگی؛ ایسے الفاظ کو اردو کے نئے، اہم اور بنیادی الفاظ (۲۰۱۱ء) اور املا نامہ (پہلا پاکستانی ایڈیشن؛ ۲۰۲۱ء) کی سفارشات کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ڈپٹی صاحب کی خود تجویز کردہ روشِ کتابت کی پابندی نہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میرے سامنے وہ رسالہ ہے جو ۱۹۱۹ء میں یعنی اُن کی وفات کے بعد چھپا ہے، اور ممکن ہے کہ کتابت کی یہ خرابیاں پچھلے ایڈیشنوں میں نہ ہوں۔عام مشاہدہ ہے کہ کتابت شدہ متون میں ہر بار کتابتی اغلاط کی تعداد بڑھتی جاتی ہے خواہ نئی کتابت کو نیا ایڈیشن نہ

بھی کہا جائے۔چوتھی بات یہ کہ بہت سے کلموں کو ڈپٹی صاحب نے اُن کی صورت خراب ہونے سے بچانے کے لیے متداول صورت میں لکھا ہے جیسے مستمند، کمترین؛ ایسے لفظوں کو توڑ کر نہیں لکھا گیا۔پانچویں بات یہ کہ ڈپٹی صاحب بہت سے ایسے ہندی لفظوں کے آخر میں ہ لگاتے ہیں جن کو آج الف کے ساتھ لکھنے کا قانون بنا کر ہ کو گویا ہندی حروف سے باہر کر دیا گیا ہے؛ ایسے تمام الفاظ کو منشائے مصنف کے مطابق رکھا گیا ہے مثلاً: زردہ، لالہ، فالسہ۔چھٹی بات یہ کہ بعض جگہوں پر کتابت کی بدخطی اور طباعتی خرابیوں کی وجہ سے عبارت ناخوانا تھی جس کی قیاسی درستی کے بجائے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کی توجہ حاصل کی گئی۔آخری بات یہ ہے کہ متن میں جہاں کسی لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے اُسے بطریقِ مروّج قلابین میں لکھا گیا ہے۔

آخر کتاب میں طلبہ کی سہولت کے لیے رسم الخط کے متن میں موجود بعض کم مستعمل لفظوں کا فرہنگ بھی لگایا گیا ہے ، اور اصل رسالے کا عکس بھی۔

***

تشکر:

اِس مضمون کے لیے مواد اور حوالہ جات کی فراہمی میں برادرم جنید فاروق زرگر (سوپور، بارہ مولہ، مقبوضہ کشمیر)، ڈاکٹر فائزہ بٹ، ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر رئیس مغل، ڈاکٹر عابدہ بتول اور ڈاکٹر ساجد جاوید چودھری نے بہت سرگرمی کی۔ڈاکٹر ابرار خٹک نے رسم الخط پر اپنا تحقیقی مقالہ عنایت کیا۔ڈاکٹر عاصم بخشی، ڈاکٹر محمد اطہر مسعود، محترمہ صائمہ بتول اور عروج راؤ کا بھی بہت شکریہ۔

حواشی

۱۔ بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ: ایک لسانی مطالعہ، ص-۲۲

۲۔ اردو کے Indo-Perso-Arabic رسمِ خط کو راقم نے ۱۹۹۸ء میں "ہند فارِبی" کا نام دیا تھا۔ ملاحظہ ہو: "اردو کارپس: تکنیکی تعارف، ضرورت، اہمیت اور دائرہ و لائحۂ عمل" مشمولہ اردو، اطلاعیات اور سائبر دنیا، ص-۳۲

۳۔ اردو رسمِ خط-ارتقا اور جائزہ، ص-۸۶

۴۔ ملاحظہ ہو: "ماقبل نوآبادیاتی عہد میں زبانِ حکمرانی کی تشکیل، جان گلکرسٹ کا اہم لسانی منصوبہ" مشمولہ اردو لسانیات اور مستشرقین، ص-۵۷ا تا آخر۔

۵۔ ملاحظہ ہو: "اردو زبان کے بیان میں" مشمولہ آثار الصنادید، ص-۳۳۵

۶۔ اردو رسمِ خط-ارتقا اور جائزہ، ص-۱۰۵

۷۔ انگریزی اصطلاح Visual Gestalt کے لیے متبادل اردو اصطلاح "فلمچہ" راقم کی تجویز ہے۔

۸۔ یہ ساری معلومات جگہ جگہ سے اور صرف بنیادی مآخذ سے لی گئی ہے جیسے جان ٹی پلیٹس، خواجہ عبدالمجید، شان الحق حقی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے لغات کے دیباچوں سے، اور گلکرسٹ سمیت دیگر لوگوں کی اپنی اپنی کتابوں سے، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی سے ۳/فروری ۲۰۰۴ء کو لیے گئے انٹرویو میں، نیز ادارۂ فروغِ قومی زبان (مقتدرۂ قومی زبان) اسلام آباد کی ویب سائٹ سے، وغیرہ۔

۹۔ یہاں جان گلکرسٹ کے لیے تعصب کا لفظ طنزاً لکھا گیا ہے۔ میں دلائل کی بنیاد پر گلکرسٹ کو متعصب نہیں سمجھتا لیکن اِس مضمون کی فضا یہ موضوع چھیڑنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔

۱۰۔ تفصیل کے لیے مثنّارک: حیاتِ جاوید، ص-۴۱۹ وغیرہ۔

۱۱۔ ایضاً، ص-۴۵۴

۱۲۔ اردو میں لسانی تحقیق، ص-۱۶۷

۱۳۔ مولوی نذیر احمد کی چار نایاب مطبوعات، ص-۱۱

۱۴۔ مکمل بحث کے لیے دیکھیے: (۱): مجلّہ بازیافت، شمارہ-۴، ص ص-۹۷ تا ۱۱۸ (ڈاکٹر عارف نوشاہی اور شاہدہ عالم کے مقالات اور رسالہ کارستان کے دیباچے کا اردو ترجمہ)؛ (۲): مقالاتِ مسعود (جلد اوّل)، ص-۱۸۸

۱۵۔ رسم الخط یعنی قواعدِ املا و اِنشائے خطِ عربی و فارسی و اردو، (ایڈیشن ۲۰۲۱ء) ص-۳۸

۱۶۔ "اردو صوتیات کا خاکہ" مشمولہ مقدماتِ شعر و زبان، ص-۲۵۲

۱۷۔ رسم الخط یعنی قواعدِ املا و اِنشائے خطِ عربی و فارسی و اردو، (ایڈیشن ۲۰۲۱ء) ص-۵۹

۱۸۔ ایضاً؛ ص-۵۵

۱۹۔ ایضاً؛ ایضاً

کتابیات

اِس مضمون کی تکمیل کے لیے وکیپیڈیا پر رکھے مختلف مضامین کے ساتھ ساتھ مندرجۂ ذیل کتابوں سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے:

۱: آثار الصنادید از سر سید احمد خاں، جلد اوّل، تنقیدی ایڈیشن از خلیق انجم، پانچواں ایڈیشن طباعت دوم، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی (۲۰۱۲ء)

۲: اردو، اطلاعیات اور سائبر دنیا، از حافظ صفوان محمد چوہان، اردو سائنس بورڈ لاہور (۲۰۲۱ء)

۳: اردو رسمِ خط- ارتقا اور جائزہ از پروفیسر نذیر احمد ملک، شعبۂ اُردو، سنٹرل یونیورسٹی، سرینگر، کشمیر (۲۰۱۵ء)

۴: اردو رسم الخط اور ٹائپ از ڈاکٹر طارق عزیز، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۷ء)

۵: اردو کے نئے، اہم اور بنیادی الفاظ از حافظ صفوان محمد چوہان، مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور (۲۰۱۱ء)

۶: اردو لسانیات اور مستشرقین از ڈاکٹر ساجد جاوید چودھری، عکس پبلشرز، لاہور (۲۰۱۹ء)

۷: اردو میں لسانی تحقیق از ڈاکٹر فائزہ بٹ، مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور (۲۰۱۷ء)

۸: املا نامہ از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (پہلا پاکستانی ایڈیشن از حافظ صفوان محمد چوہان)، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور (۲۰۲۱ء)

۹: بازیافت (مجلہ)، شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، شمارہ ۴

۱۰: بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ: ایک لسانی مطالعہ از شانتی رنجن بھٹّاچاریہ، نصرت پبلشرز لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، (۱۹۸۹ء)

۱۱: پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان از ڈاکٹر رشید اختر ندوی، قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، قائدِ اعظم یونیورسٹی اسلام آباد (۱۹۹۵ء)

۱۲: پاکستانی زباناں (پنجابی ادب شمارہ ۱ تا ۹۹ کا انتخاب)؛ ۲- کلب روڈ، نرسنگھ داس گارڈن، شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور (۲۰۱۲ء)؛ محمد آصف خاں صاحب کے کئی مقالات۔

۱۳: حیاتِ جاوید از خواجہ الطاف حسین حالی (محقّق ایڈیشن از حافظ صفوان محمد چوہان)، اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور (۲۰۲۰ء)

۱۴: رسم الخط یعنی قواعدِ اِملا و اِنشائے خطِ عربی و فارسی و اردو از ڈپٹی نذیر احمد، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج (پانچویں بار) (۱۹۱۹ء)

۱۵: مقالاتِ سر سید (مختلف جلدیں) مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور

۱۶: مقالاتِ مسعود (جلد اوّل) از ڈاکٹر محمد اطہر مسعود، اورینٹل پبلیکیشنز لاہور (۲۰۱۴ء)

۱۷: مقدماتِ شعر و زبان، از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن (۱۹۶۶ء)

۱۸: مولوی نذیر احمد کی چار نایاب مطبوعات، مرتّبہ اسلم پرویز، انجمنِ ترقیِ اردو ہند (۲۰۱۲ء)

۱۹: Current Corpus-Based Urdu-English Dictionary، مؤلّفہ حافظ صفوان محمد چوہان، چودھری غلام رسول اینڈ سنز لاہور (۲۰۰۹ء)